تقریظ و انتقاد

تعلیمات قرآن

تالیف مولنا اسلم جیراجپوری ضخامت ۲۲۰ صفحہ۔ قیمت عا۔ پتہ: قرول باغ۔ دہلی۔

قرآن کریم کی آیات کو مضامین کے اعتبار سے مرتب کرنے کی متعدد کوششیں ابتک کی جاچکی ہیں اور اس سلسلہ میں بعض اچھی کتابیں شایع بھی ہوی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں آیات قرآنی کو صرف مضامین کے اعتبار سے مرتب کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُس ترتیب سے نتایج اخذ کرنے اور مختلف مسایل کے متعلق قرآن کی تعلیمات کو ایک مسلسل اور مرتب بیان کی صورت میں پیش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والا ایک نظر میں قرآن کے مقصود و مدعا کو معلوم کر سکے۔ اس طرح یہ کتاب محض تبویب القرآن ہی نہیں ہے بلکہ تفسیر القرآن بالقرآن بھی ہے۔ اس میں شک نہیں، جیسا کہ جناب مؤلف نے خود اعتراف فرمایا ہے کہ اس قسم کی کوئی کتاب انسان کو قرآن سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ قرآن تو ایک بحر بے کنار ہے جس کے مضامین کو عنوانات کی قید میں لانا بہت مشکل ہے لیکن آج کل جبکہ ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ حضرات قرآن مجید کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں رکھتے، ایسی کتابوں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جن میں قرآن کی تعلیمات کا نچوڑ خود قرآن ہی کے الفاظ میں پیش کر دیا گیا ہو تاکہ وہ قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک تفہیمی مقدمہ کا کام دے سکیں۔

زیر نظر کتاب میں مؤلف نے قرآنی تعلیم کے چھ اہم ترین مسئلوں کو بیان کیا ہے۔ خالق، مخلوق، دین، رسالت، کتاب اور معاد۔ ان میں سے ہر عنوان کے تحت انہوں نے متعدد ذیلی عنوانات قائم کیے

ایک سلسلہ کے ساتھ آیات قرآنی درج کی ہیں اور بیچ بیچ میں مختصر تفسیری و تشریحی جملے بھی لکھدیے ہیں جن سے خیالات کا ربط اور تسلسل قائم ہونے میں مدد ملتی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے الفاظ اور بیانات کو کم سے کم جگہ دی ہے۔ اور بڑے بڑے مباحث کو سمیٹ کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں ادا کر دیا ہے۔

قرآن کریم کی خدمت سے زیادہ مبارک خدمت دنیا میں کوئی نہیں ہے، اور جو شخص اس خدمت کو انجام دے، وہ اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کا شکریہ ادا کریں، اور اس کے کام کی قدر کریں لیکن یہ خدمت جتنی مبارک ہے اتنی ہی نازک بھی ہے۔ قرآن کی نسبت سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کے خیالات اور عقاید پر بہ نسبت دوسری چیزوں کے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے جو چیز بھی قرآن کی نسبت سے پیش ہو اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ پیش کرنے والے کا بھی فرض ہے کہ وہ ہر بات اور ہر مسئلے کی صحت کا زیادہ سے زیادہ اطمینان کرے اور دوسروں کا بھی فرض ہے کہ اگر کوئی فروگذاشت ان کو نظر آئے تو نکتہ چینی و خردہ گیری کی نیت سے نہیں بلکہ خدمت قرآن کی نیت سے اس کو واضح کر دیں تاکہ آیندہ اس کی تصحیح ہو سکے۔ مولف کی علمی شان سے ہمکو توقع ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے پوری احتیاط برتی ہوگی، اور وہی پیش کیا ہوگا جو ان کے نزدیک صحیح تھا لیکن ہمارے نزدیک کتاب میں اب بھی متعدد فروگذاشتیں رہ گئی ہیں۔ اس لئے ہم بھی انہیں پیش کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ اگر جناب مولف ہمارے کسی بیان سے مطمئن نہ ہو سکیں تو انہیں حق ہے کہ ہم سے مزید تحقیق و تبیین کا مطالبہ کریں۔

جن و انس | صفحہ ۲۰۸ پر جن و انس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ دونوں لفظ "جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں"۔ یہ تشریح غالباً اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے کی گئی ہے جو حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں جنوں کے شریک ہونے پر عموماً کیا جاتا ہے لیکن جس آیت پر یہ نوٹ لکھا گیا ہے اس میں "جن اور انس" کے ساتھ "طیر" کو بھی حضرت سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل کیا گیا ہے۔ کیا یہ طیر بھی انسانوں ہی کا کوئی طبقہ تھا؟ پھر دوسری جگہ بیان کیا گیا

ہے کہ ہوا حضرت سلیمانؑ کے تابع کی گئی تھی؟ وَلِسُلَیْمَانَ الرِّیْحَ غُدُوُّھَا شَھْرٌ وَّرَوَاحُھَا شَھْرٌ۔ کیا ہوا سے مراد بھی انسانوں کا کوئی طبقہ لیا جا سکتا ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو محض لفظ جن کی تاویل کرنے سے کیا حاصل؟ تاویل تو ایسی ہونی چاہئے جو قرآن کے دوسرے بیانات سے مطابقت رکھتی ہو۔ قرآن مجید میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ شیاطین حضرت سلیمان کے تابع تھے وَالشَّیَاطِیْنَ کُلَّ بَنَّاءٍ وَّغَوَّاصٍ۔ دوسری جگہ شیطان کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ وہ جن تھا۔ کَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ تیسری جگہ جنوں کے متعلق فرمایا گیا ہے وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ اور چوتھی جگہ شیطان کی حقیقت خود اس کی زبان سے یہ بیان کرائی گئی ہے کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ۔ ان سب بیانات سے متحقق ہوجاتا ہے کہ جو جن حضرت سلیمان کے تابع کئے گئے تھے وہ آتشیں مخلوق ہی تھے۔ مگر وہ کیسے جن تھے؟ اور ان کی ماہیت کیا تھی؟ یہ ہم کو نہیں بتایا گیا اور جب اس راز کو کھولا نہیں گیا تو محض قیاس آرائی سے ہم کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

جناب مؤلف کا یہ کلیہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے وَکَذٰلِکَ جَعَلْنَا لِکُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ، اور وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذَیْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ، اور وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَھَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ میں اگر جنوں سے انسانوں ہی کا کوئی طبقہ مراد ہے تو اس کو انسان ہی کیوں نہ کہا گیا۔ "جن" کے جداگانہ لفظ سے کیوں تعبیر کیا گیا۔ اور اگر وہ انسانوں ہی کا کوئی الگ طبقہ ہے تو آخر وہ کونسا طبقہ ہے؟ غالباً مؤلف نے ان لوگوں کی رعایت مدنظر رکھی ہے جن کو "جن" نامی ایک آتشین مخلوق کے وجود سے انکار ہے۔ مگر شاید انہوں نے غور نہیں فرمایا کہ ان لوگوں کے دلائل علمی حیثیت سے بہت کمزور ہیں۔ اتنے کمزور کہ ان سے مرعوب ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ایسی باتوں سے مرعوب ہونے کا زمانہ مدت ہوئی کہ گذر گیا۔

قبت معنی خلا مؤلف نے ہر جگہ خلافت کے معنی بادشاہی کے لئے ہیں اور صفحہ ۴۶ پر اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کا ترجمہ "میں زمین میں ایک بادشاہ بنانے والا ہوں" کر کے اس پر نوٹ لکھا ہے کہ :-

خلافت کے معنی جانشینی کے ہیں ۔ اور خلافت فی الارض کے معنی ایک کی جگہ دوسرے کو زمین کا بادشاہ بنانا ہیں ۔

ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ پھر ان کے بعد زمین میں ہم نے تم کو جانشین بنایا مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ کہ دیکھیں تم کس طرح کام کرتے ہو ۔

حضرت آدم اپنے سے پہلے ساکنان زمین کے بجائے بادشاہ بنائے گئے تھے ۔ نیابت حق یا خلافت الٰہی کا خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اللہ جس کی شان یہ ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ اس کا جانشین کوئی کیونکر ہو سکتا ہے ۔"

اس میں شک نہیں کہ اس آیت کی وہ تفسیر بھی ہو سکتی ہے جو مؤلف نے کی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس کی تفسیر خلافت الٰہی سے کرنا غلط ہے ۔ بات یہ ہے کہ آیت میں صرف لفظ "خلیفہ" آیا ہے جس کے معنی جانشین، نائب اور قائم مقام کے ہیں اس کے ساتھ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے صریح مفہوم یہ نکلتا ہو کہ میں ان لوگوں کی جگہ ایک دوسری مخلوق کو بادشاہ بنانے والا ہوں جو اب تک زمین میں بستے تھے"۔ بلکہ آیت کے الفاظ سے صرف یہ مفہوم نکلتا ہے کہ "میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں" اس کی تاویل اگرچہ وہ بھی کی جا سکتی ہے جو مؤلف نے کی ہے ۔ مگر اس کی یہ بھی تاویل کی جا سکتی ہے کہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت سے سرفراز کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا ۔ اس تاویل میں جو قباحت مؤلف نے ظاہر کی ہے وہ محض لفظ "جانشین" سے پیدا ہو گئی ہے ۔ حالانکہ اگر وہ اگر خلیفہ کا ترجمہ "نائب" کرتے تو کوئی قباحت نہ رہتی ۔ اگرچہ حق تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے لیکن پردہ میں ہے ۔ اور پردہ میں رہنے والے کی نیابت، پردہ کے باہر رہنے والا کر سکتا ہے ۔ اس نیابت کے تخیل میں جو رفعتیں ہیں

وہ پرانے ساکنین ارض کی جانشینی کے تخیل میں ہرگز نہیں ہیں۔ کاش مولانا لفظی قیود سے بالاتر ہو کر معانی کے عالم میں ان دونوں مفہوموں کا فرق ملاحظہ فرماتے۔

قرآن مجید کی بکثرت آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خلافت سے مراد زمین میں خدا وند تعالےٰ کی نیابت ہی ہے۔ جگہ جگہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی و برتری دی (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ) اور ہم نے ان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی (وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا) اور زمین میں جو کچھ ہے ان کے لئے مسخر کر دیا (سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ)۔ پھر فرمایا گیا کہ جس بار امانت کو سنبھالنے کی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کی مخلوق کو ہمت نہ ہوئی تھی، وہ بار انسان نے اٹھا لیا۔ اس سلسلہ کی تمام آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے علم، اپنی قدرت، اپنی عقل، اپنی قوت تمیز اور اپنی حاکمانہ برتری کے اعتبار سے تمام ان مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے جو زمین اور اس کے ماحول میں موجود ہیں، اور اسی برتری کے اعتبار سے اس کو مجازاً نہ کہ حقیقی لغوی معنوں میں "خلیفۂ خدا" کہا گیا ہے۔ اس خلافت کے مقام اور حیثیت سے آگاہی بخشنے کا مقصود دراصل یہ جتانا ہے کہ نائب ہونے کی حیثیت سے انسان کو اپنے محکوموں اور اپنی تابع فرمان اشیاء کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرنا چاہئے جیسا کہ خود رب العالمین کا معاملہ ان کے ساتھ ہے۔ اَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ کی آلہی نصیحت اسی اصل پر مبنی ہے۔

آدم کا گناہ صفحہ ۷۴ پر لکھا ہے کہ "آدم کے گناہ کو اللہ نے معاف نہیں کیا ورنہ ان کو جنت سے نہ نکالتا۔ صرف ان کی توبہ قبول کی" یہ تفسیر بالرائے کی ایک بری مثال ہے۔ توبہ قبول کرنے کا مفہوم گناہ معاف کر دینے کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے واضح کیا جائے۔ حضرت آدم کے متعلق حق تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ نہ صرف ان کی توبہ قبول کی گئی بلکہ ان کو برگزیدہ کیا گیا اور انہیں ہدایت بخشی گئی (ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ)۔ پھر صفحہ ۱۳۹ پر خود مولف نے آدم کے نبی ہونے کا احتمال ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ نے آدم کا گناہ معاف نہیں کیا؟

رہا یہ سوال کہ اگر حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو معاف کر دیا تھا تو انہیں جنت سے کیوں نکال دیا؟ تو اس کا جواب خود قرآن ہی سے مل جاتا ہے۔ قرآن میں یہ کہاں ارشاد ہوا ہے کہ آدم جنت میں رہنے کے لئے پیدا کئے گئے تھے؟ وہاں تو صاف کہدیا گیا ہے کہ جب آدم کا ہیولیٰ تیار ہوا تھا اسی وقت ان کو زمین کی خلافت دینے کا ارادہ ظاہر کر دیا گیا تھا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ اس تصریح کے بعد اس شبہ کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے؟

قبول توبہ اور عفو تقصیر میں جو فرق مولٰنا نے کیا ہے وہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جہاں جہاں قرآن میں توبہ قبول کرنے کا ذکر آیا ہے وہاں اس سے مراد عفو تقصیر ہی ہے، اور یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے کہ وہ کفار و مشرکین تک کو یہ امید دلاتا ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرو اور اپنے گناہ سے باز آجاؤ تو خدا تمہارے پچھلے قصور معاف کر دیگا۔ یہ رحمت اور عفو و کرم کا دروازہ جو اسلام نے کھولا ہے۔ وہ اس تفریق سے بند ہو جاتا ہے جو قبول توبہ اور عفو گناہ میں کی گئی ہے۔

غلامی کا مسئلہ صفحہ ۵۵ پر مولٰنا نے لکھا ہے:۔

> "ایک انسان کا دوسرے کو غلام بنانا فطرت کے خلاف ہے لیکن دنیا میں غلامی رائج ہو گئی تھی اور نزول قرآن کے زمانے میں عربوں کے پاس بھی مملوک تھے قرآن نے بعض مصالح کی وجہ سے ان مملوکوں پر جو ان کی غلامی میں آچکے تھے ان کی ملکیت کو بدستور رہنے دیا۔"

اس کے بعد انہوں نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:۔

> قرآن میں جہاں بھی مملوکوں کا ذکر ہے بصیغہ ماضی یعنی ملکت ایمانکم ہے۔ بصیغہ مستقبل کہیں نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن غلاموں کے وہ مالک ہو چکے تھے صرف انہی کی ملکیت قائم رکھی گئی تھی۔"

یہ متن اور حاشیہ دونوں نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں انسانی کمزوریوں کا لحاظ رکھ کر تدریجی طریقے سے اصلاح کی گئی ہے لیکن کوئی مثال قرآن میں ایسی نہیں ملتی کہ کسی مسئلے میں اس نے اپنی تدریجی اصلاح کو ناکمل چھوڑ دیا ہو اور آخری اصلاح کا حکم نزول وحی کے زمانہ ہی میں نہ دیا ہو۔ یہ قاعدہ کلیہ اگر درست ہے تو کیا غلامی کے مسئلہ میں قرآن مجید کا کوئی ایسا حکم دکھایا جا سکتا ہے جس نے غلامی کی ہر شکل کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیا ہو؟ رہی یہ بات کہ عرب میں چونکہ غلامی رائج تھی اور لوگوں کے پاس ممالیک موجود تھے اس لئے غلامی کو مصلحتاً باقی رکھا گیا، تو غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ ایسی مصلحت شناسی کو خدا کی طرف منسوب کرنا دراصل خدا کی طرف کمزوری کو منسوب کرنا ہے جس خدا نے شراب کو حرام کر دیا اور اس معاملہ میں بندوں کی خواہشات کی ذرا پرواہ نہ کی، جس نے زنا کو حرام کر دیا، اور اس امر کی ذرا پروا نہ کی کہ عرب اور دوسرے ممالک میں زنا کا کس قدر رواج تھا اس کو کونسا امر غلامی کی ہر صورت کو قطعاً حرام کر دینے سے روک سکتا تھا؟

بات دراصل یہ ہے کہ غلامی کی دو صورتیں اس وقت دنیا میں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ بعض ممالک کے آزاد باشندوں کو پکڑ کر ان کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو غلام بنا لیا جاتا تھا۔ ان دونوں شکلوں میں سے پہلی شکل کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً ممنوع قرار دیا اور فرمایا کہ جو شخص کسی آزاد کو پکڑ کر بیچے گا اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی ہونگا۔ (بخاری کتاب البیوع) اور دوسری شکل کے متعلق اسلام کا قانون یہ قرار پایا کہ جو لوگ جنگ میں گرفتار ہوں ان کا یا تو احسان کے طور پر رہا کر دیا جائے یا فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے یا دشمن سے مسلمان قیدیوں کے ساتھ ان کا مبادلہ کر لیا جائے لیکن اگر رہا کر دینا جنگی مصالح کے خلاف ہو، اور فدیہ وصول نہ ہو سکے، اور دشمن اسیران جنگ کا مبادلہ کرنے پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمانوں کو حق ہے کہ انھیں غلام بنا کر رکھیں۔ البتہ اس قسم کے غلاموں کے ساتھ انتہائی حسن سلوک اور رحمت و رافت کے برتاؤ کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کو تعلیم و تربیت دینے اور

انہیں سوسائٹی کے عمدہ افراد بنانے کی ہدایت کی گئی ہے، اور مختلف صورتیں ان کی رہائی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اس باب میں اسلام کا صحیح قانون معلوم کرنے کے لئے قرآنی احکام کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور آپ کے ارشادات، اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عمل کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے مؤلف کی غلطی کا اصل سبب یہی ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔

ما ملکت ایمانکم سے جو نکتہ مؤلف نے پیدا کیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے نزول قرآن کے بعد بھی صحابہ کے عہد میں بہت سے اسیران جنگ کو ممالیک کی حیثیت سے رکھا گیا ہے خود اہل بیت رسول کے گھروں میں جنگ سے پکڑے ہوئے غلام اور مفتوح ممالک سے آئی ہوئی لونڈیاں موجود تھیں۔ تو کیا ان سب لوگوں نے حکم قرآن کی دانستہ خلاف ورزی کی؟ یا یہ سب قرآن کے حکم سے ناواقف تھے؟

پھر اگر یہ قاعدہ بنا لیا جائے کہ جو کچھ قرآن میں بصیغۂ ماضی کہا گیا ہے اس سے مراد صرف ماضی ہی ہوگا، حال یا مستقبل نہ ہوگا، تو اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ کی تاویل آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں کہ "عنقریب قیامت آئے گی تو چاند پھٹ جائے گا" اور کَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کا ترجمہ آپ نے "اس کا عرش پانی پر ہے" کیوں فرمایا ہے؟

آگے چل کر مؤلف نے حَتّٰۤی اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً سے یہ استدلال کیا ہے کہ:۔

> "غلامی کا صرف ایک ہی رستہ تھا یعنی اسیران جنگ۔ قرآن نے ان کو آزاد کرنیکا حکم دے کر ہمیشہ کے لئے اس راستہ کو بند کر دیا۔"

لیکن مولانا نے یہ غور نہ فرمایا کہ اگر کفار نہ مال کی صورت میں فدیہ دیں، اور نہ اسیران جنگ کا مبادلہ کریں تو کیا ایسی صورت میں بھی مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ لازماً اسیران جنگ کو بطور احسان رہا کر دیں؟ اگر اسیران جنگ کو رہا کرنے سے دشمن کو مزید قوت پہنچنے کا خطرہ ہو، اور مسلمانوں کو اندیشہ ہو کہ

یہ لوگ آزاد ہو کر پھر ہم سے لڑنے آئیں گے تو کیا اس صورت میں بھی یہ حکم ہے کہ انھیں رہا کر دیا جائے؟ کم از کم آیت کے الفاظ سے یہ قطعی اور لازمی حکم نہیں نکلتا۔ آیت میں "منًّا" کا لفظ ہے جس کے معنی احسان رکھنے کے ہیں۔ اور قرآن میں کہیں احسان کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بلکہ ہر جگہ اسے فضلیت کا درجہ دے کر اس کی طرف ترغیب دلائی گئی ہے اسی طرح یہاں بھی قرآن مجید کا مقصود یہ ہے کہ احسان رکھ کر چھوڑ دینا زیادہ افضل اور بہتر ہے لیکن اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اگر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچتا ہو تب بھی احسان کیا جائے، اور ضرور ہی کیا جائے۔

زمین کی ملکیت کا مسئلہ صفحہ ۵ پر مولف نے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ حکم نکالا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت (زمینداری) ناجائز ہے چنانچہ اپنے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ:-

> زمین کی وراثت کا جہاں جہاں قرآن میں ذکر ہے ...... اس کے معنی حکومت کے ہیں شخصی ملکیت یعنی زمینداری کے نہیں ہیں۔ قرآن نے بجز حق انتفاع کے زمین پر حق ملکیت عطا نہیں کیا ہے۔"

یہاں پھر نکتہ آفرینی کی کوشش میں مولانا حق سے تجاوز کر گئے ہیں۔ انھیں غور فرمانا چاہئے تھا کہ زمین کی شخصی ملکیت کا دستور نزول قرآن کے وقت تمام دنیا میں رائج تھا صدیوں سے رائج چلا آرہا تھا۔ اور تمدن کے اساسی دستوروں میں داخل ہو گیا تھا۔ اگر قرآن کا مقصود فی الحقیقت اس نظام تمدن میں ایسی اساسی ترمیم کرنا ہوتا، اور اگر وہ فی الواقع زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا چاہتا جس کی جڑیں انسانی تمدن میں اتنی گہری جمی ہوئی تھیں، تو کیا ایسی انقلاب انگیز کارروائی کے لئے وہی زبان موزوں ہو سکتی تھی جو وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ میں استعمال کی گئی ہے؟ ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسی اہم اور اساسی اصلاحوں کے لئے محض سرسری اشارے کافی نہیں ہوتے بلکہ صریح احکام دینے ضروری ہوتے ہیں پھر یہ بھی کافی نہیں ہوتا کہ محض سابق دستور کو مٹا دیا جائے، بلکہ اس کو مٹانے

کے ساتھ خود اپنی طرف سے ایک دوسرا دستور بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ اب کیا مولانا یہ بتا سکتے ہیں کہ قرآن نے شخصی ملکیت کا قاعدہ منسوخ کر کے کونسا دوسرا قاعدہ اس کی جگہ مقرر کیا؟ اور اگر قرآن کا منشا کوئی دوسرا قاعدہ مقرر کرنا ہی تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین نے شخصی ملکیت کے قدیم دستور کو کیوں باقی رکھا، اور خود لوگوں کو جاگیریں دیں؟

جس آیت سے مولانا استدلال فرما رہے ہیں اس کے الفاظ اور موقع و محل پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مقصود کوئی قانون بنانا نہیں ہے، بلکہ خدا کی قدرتوں کا بیان ہے۔ ساری تقریر اس انداز پر ہے کہ "رحمان نے قرآن کا علم دیا، انسان کو پیدا کیا، اسے بیان کی قوت دی۔ اسی کے حکم سے چاند سورج گردش میں ہیں۔ درخت اور گل بوٹے سب اسی کے آگے سربسجود ہیں۔ اس نے اوپر آسمان کو چھا دیا، اور نیچے خلقت کے فائدہ کے لئے زمین بچھا دی جس میں میوے اور کھجور کے درخت ہیں، اور طرح طرح کے اناج اور خوشبودار پھول ہیں۔ اب تم اپنے پروردگار کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے"۔ اس تقریر میں تمدنی قانون بیان کرنے کا کونسا موقع تھا؟ اور صرف یہ فقرہ کہ "نیچے خلقت کے فائدہ کے لئے زمین بچھا دی" یہ معنی کہاں دیتا ہے کہ زمین پر شخصی ملکیت ناجائز ہے؟ قرآن سے احکام نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ اور اس کے موقع و محل اور سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے۔ پھر اس امر کا بھی لحاظ کیا جائے کہ جو قانون ہم اس آیت سے اخذ کر رہے ہیں آیا اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں عملاً جاری بھی فرمایا تھا یا نہیں۔ اگر معلوم ہو کہ آپ نے ایسا قانون جاری نہیں فرمایا بلکہ آپ کا عمل اس کے خلاف رہا تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ بادی النظر میں قرآن کا جو مفہوم ہم سمجھ رہے ہیں۔ وہ غلط ہوگا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے بھیجے گئے تھے کہ قرآن میں جو احکام دئے گئے ہیں ان پر عمل کر کے بتائیں اور زندگی کے معاملات میں ان کو جاری کر دیں اگر آپ احکام قرآنی کے مطابق زندگی کے قدیم طریقوں میں اصلاح نہ فرماتے اور الٰہی قوانین کو نافذ کرنے کے بجائے پرانے دستوروں کی پیروی کرتے تو نعوذ باللہ آپ کی بعثت بالکل فضول ہوتی، بلکہ بعثت کا اصل منشا ہی فوت ہو جاتا۔ کم از کم اتنا تو ہر شخص تسلیم کرے گا کہ آنحضرت صلعم کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ باقی